

دوست کبھی کبھار اُس سے ملنے یا کوئی کام نکلوانے آتے رہتے تھے۔ ان کی شادیاں ہوئیں، بچے ہوئے، پھر مصطفیٰ اُس نیشنٹھ کی جنگ میں ہلاک ہو گیا وہ افسوس کے لیے اس کے گھر تک نہیں جا سکا، صرف خط پر گزارہ کر لیا۔ اقبال بیمار پڑ گیا۔ آفتاب نے اسے لا ہو رہ بلوابا اور مل ملا کر اُسے میونسپیال میں داخل کر دادیا۔ مگر ان بیس برسوں میں وہ ایک بار بھی سائٹھ ستر میل کا یہ فاصلہ طے نہ کر پایا تھا۔ اب وہ کیسے اُس چورا ہے میں جا کر کھڑا ہو؟ ہو مل کے اس ایک کمرے نے حقیقت اُس پر واضح کر دی تھی۔ وہ اس شر سے جا چکا تھا۔

”ابو۔“ اُس کے بیٹے کی سوئی بسوئی آواز آئی۔

آفتاب نے مرڑ کر دیکھا۔ ”جاگ گئے ہو؟“

”عمران کے ابو نے نئی کرسی خریدی ہے۔“

”اچھا؟ کبیسی کرسی ہے؟“

”وہ گھومتی ہے۔“

”اچھا۔“

ابھی اس بات کو چوبیں گھننے بھی نہیں گزرے تھے۔ کل شام کو فاروق اور عمران اُن کے باعثے میں کھیل رہے تھے۔ آفتاب نہادھو کر باہر نکل آیا تھا اور کرسی پر بیٹھا ایک کبیس کی برلیف کامطالعہ کر رہا تھا۔ سورج ابھی غروب ہوا تھا۔ نسرین اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھی ایک رسالہ پڑھ رہی تھی۔ آفتاب نے پاؤں چپی سے نکال کر آہستہ سے زمین پر رکھ دیے۔ گھاس کی نرم نرم ٹھنڈک اُس کے تلووں کو آرام مہنچانے لگی۔ پڑھنے پڑھنے اُس نے بے خیالی سے سر اٹھا کر دیکھا تو اُس کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی۔ اُس ایک لمبے کی یہ سادی بات تھی۔ اُس کا دماغ وقت کے ایک نقطے پر منجذب ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نقطے کے اندر بہت سی باتیں ایک ساتھ تیزی سے ایک دوسری کے گرد گھومنے لگیں۔ آج اُبیس جون تھی۔ کل بیس ہو گی۔ فاروق اُس کا بیٹا دس سال کا تھا۔ وہ خود

چالیس سال کو پہنچ چکا تھا۔ تیس سال پہلے وہ دس سال کا تھا۔ اُس کا باپ چالیس سال کا تھا۔ خیال کے اس نقطے کی گردش کے اندر ان متواتر عناصر کا ایک جا ہو جانا ایک سحر کے مانند تھا جو کچھ دیر کے لیے اس کے اور پر طاری ہو گیا۔ اُس کی گود میں پڑے ہوئے کاغذات اور ان پر تحریر داستان اور سامنے بیٹھی ہوئی اُس کی بیوی، سب کچھ اُس کے دماغ سے خارج ہو چکا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس نقطے کی گردش کا ایک محور ہے جس میں ایک الیسی قوت ہے کہ وہ بے ساختہ اُس کی جانب کھنچا چلا جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ اُس پر یہ بات کھلی کہ یہ محور اُس کا شر تھا۔

دہیں بیٹھے بیٹھے، بغیر سوچے آفتاب نے اپنے دل میں یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے اپنی بیوی سے بات کی۔ اُس کی بیوی کو اس بات کی سمجھنیں آ رہی تھی کہ وہ خود تو بیٹھے بیٹھے تیار ہو گیا تھا، مگر اس کرمی میں فاروق کا ہمراہ جانا کیوں ضروری تھا۔ مگر پھر وہ اس خیال سے خاموش ہو گئی کہ وہاں پر آفتاب کے ماں باپ کی قبریں تھیں اور وہ کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔ آفتاب نے اپنے اسٹنٹ کو بلا بھیجا، اور بیس ہون کی عدالتی حاضریوں کے بارے میں ہدایات دیں۔ فاروق کو اُس نے اپنا شردا کھانے، اور وہاں پہنچ کر ایک بڑی دلچسپ کہانی سُنانے کا وعدہ کر کے تیار کر لیا۔ رات پھر وہ ٹھیک سے سونے سکا۔ اُس کا دماغ اُس نقطے پر مرکوز رہا، جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ جیسے رات گزرتی گئی اُس کے دل میں بہ خیال پکا ہونا گیا کہ یہ نقطہ ایک راز کا حامل ہے، اور ہونہ ہو یہ راز وہ قدیم کرہ ہے جس نے تیس برس سے اُس کے دماغ کے ایک حصتے کو مغلونج کر رکھا ہے۔ شاید اُس کرہ کے کھلنے کا وقت آگیا تھا!

”میں وہاں بیٹھا تھا۔“ فاروق نے بستر پر لیٹے لیٹے کہا۔

”ہنہہ!“

”کرسی پر۔“

”اچھا؟“ آفتاب نے بے خیالی سے کہا، گھومتی ہے؟“

”ہاں۔ گول گول۔“ فاروق ہاتھ اٹھا کہ ہوا میں گھماتے ہوئے بولا، گول گول۔ ابو؟“

”ہوں۔“

”کیا وقت ہوا ہے؟“

”چار نجے ہیں۔“

”اب چلیں؟“

بچہ کھانی سننے کے لیے بے تاب تھا۔ ”ہاں“ آفتاب نے کہا، ”چلو

چلیں۔“

عصر میں کچھ وقت رہتا تھا۔ شہر ابھی سُنسان پڑا تھا، گوکھیں کہیں پرمندگی کے آثار منودار ہونے لگے تھے۔ بازار میں دکابین کھل رہی تھیں اور کسی کسی حصتے میں نز کا وکیا جا رہا تھا۔ مگر گاہک ابھی گھروں سے نہ لکے تھے۔ صرف دکانداروں کے پاس روزمرہ کے بیٹھنے والے دوست احباب آکر جمع ہو رہے تھے۔

سر پر چھاتا تا نے اُس کے سایے کے اندر اندر چلتے ہوئے دونوں باپ بیٹیا بازار پہنچ گئے۔ بازار میں پہنچ کر سپلی بار آفتاب کو کچھ چھروں کی پہچان ہوتی۔ مگر یہ پہچان کوئی اصل پہچان نہ تھی، بلکہ الیسی تھی جیسے درختوں یا مکانوں کی ہوتی ہے۔ یہ دکانداروں کے قدیم چہرے تھے جنہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ سے دیہیں بیٹھے ہوئے دیکھتا آیا تھا۔ کچھ کی دائرہ ہیں سفید ہو چکی تھیں، باقی تقریباً دلیے ہی تھے۔ اُن میں سے کسی نے آفتاب کی طرف توجہ نہ دی۔ آفتاب کالی عینک اور چھاتے میں چھپا چھپا بازار سے گزر گیا۔ جس جگہ پہنچ کر ان کو سرکلہ روڈ کی جانب مڑنا تھا وہاں کونے پر ٹنڈا کتابوں والا اپنا کام شروع کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ڈبہ سی دکان کے تھڑے پر مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی سی

مُستطیلِ بھٹی پڑی تھی۔ بھٹی میں اُس نے کوٹلے بھر دیے تھے مگر ابھی آگ نہیں
لگائی تھی۔ ٹنڈا انھڑے پہ بیٹھا ایک میلے سے گیلے چیتھڑے کے ساتھ انہی پندرہ
بیس سلاخیں ایک ایک کر کے صاف کر رہا تھا۔ بھٹی کے پاس ایک میلی سی
کٹی بھٹی ہوئی سپکھی پڑی تھی جسے وہ کوٹلے دہکانے کے لیے استعمال کیا کرتا
تھا۔ سپکھی کو دیکھ کر آفتاب کو خجال ہوا کہ شاید یہ دری سپکھی ہو جو بیس برس
پہلے اُس کے پاس ہوا کہ تھی۔ ابھی کچھ دیر میں، آفتاب نے سوچا، اس بھٹی سے
دھوائی اٹھنے لگے گا، جس سے پیٹ بھروں کو محبوک لگ جائے گی۔ شام کی
نماز سے پہلے ہی یہاں لوگوں کا جمگھٹ پڑ جاتا تھا جو عشاء تک چھٹا نہ تھا۔
مگر جیسے ہی عشاء کی اذان ہوتی ٹنڈا اپنی سلاخوں کو قبیحے کی خالی کنالی میں دھو
دھا کر ایک طرف رکھ دیتا، بھٹی کو نالی میں انڈیل کر خالی کرتا جہاں راکھ میں
ملے ہوئے چند سرخ کوٹلے قسول سُون کر کے بچھ جاتے، اور بھٹی کو اٹھا کر اندر
دکان میں جا رکھتا۔ پھر وہ دکان بند کر کے گھر کی راہ لیتا۔ اُس کا بایاں ہاتھ سلا
تھا اور دایاں کہنی سے ذرا بیخے تک کٹا ہوا تھا۔ مگر وہ اپنا سارا کام شروع سے
آخر تک اکیلا کرتا تھا۔ جب سے آفتاب نے ہوش سنبھالا تھا یہ کبابی
ایک ڈربہ نما دکان میں ایک چھوٹی تختی کے ساتھ کی بھٹی اور اپنے ایک ہاتھ
کے ساتھ کام کرتا آرہا تھا اور شریح میں مشہور تھا۔ آفتاب نے سوچا
کہ اگر وہ اپنی عینک اتار کر اُس کے پاس جا کھڑا ہوا اور اُس سے بات کرے تو وہ
ضرور اُس کو پیچاں لے گا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کے سارے عرصے میں
ہر قیصرے چوتھے روز شام کو آفتاب اُس دکان کے گرد لگے ہوئے جمگھٹ
میں جا کھڑا ہوتا تھا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگتا تھا۔ پھر انتظار کے بعد
جب اُس کی باری آتی تھی تو اخباری کاغذ کے اوپر ترختے ہوئے گرم گرم کباب
اور پیاز کی تیز چیزیں ہاتھ پر رکھے، زبان کے پیچے سے اُبل کر نکلتے ہوئے مجھوکے
لُعاب کو نگلتا ہوا وہ گھر کی طرف دوڑ پڑتا تھا۔ دکان کے پاس سے نکلتے ہوئے

آفتاب نے مڑ کر دیکھا۔ ٹنڈا اسی طرح سینخیں صاف کر رہا تھا۔ چند منٹ کے اندر وہ بازار سے نکل کر سرکلر روڈ پر پہنچ چکے تھے۔ سڑک پر اب تانگے اور سائیکل سوار نظر آنے لگے تھے، گودھوں ابھی اسٹھنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دُور نیک سرکلر روڈ پر چلنے کے بعد دونوں باپ بٹیا سڑک کے ساتھ ساتھ مڑنے کی بجائے سیدھے ایک ایسے راستے پر نکل گئے جو شرک کے وسطیٰ حصتے کو جرنی سڑک سے ملاتا تھا۔ آدھے میل کا یہ رستہ غیر آباد ہوا کرتا تھا۔ اب یہ کمی سڑک کی شکل اختیار کر چکا تھا جس کے دونوں جانب چھوٹی بڑی فیکٹریاں ہی فیکٹریاں تھیں۔ یہ بیچج میں بڑی بڑی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ آبادی باشکن نئی تھی ان فیکٹریوں اور کوٹھیوں کے ساتھ ساتھ گندے سے بدبو دار پانی کے جو ہٹر پیدا ہو چکے تھے جن کی سطح چھروں سے سیاہ ہو رہی تھی۔ آفتاب تیر تیر چلتا ہوا اس علاقے سے نکل گیا۔

وہ جرنی سڑک پر چڑھے تو دفعتہ آفتاب کو یوں محسوس ہوا جیسے وقت پلٹ کر کھڑا ہو گیا ہو۔ اس وقت کے اندر دنیا جوں کی نوں فائم تھی اور وہ اس دنیا کا سدا بہار پچھرا اس حگہ پر کھبلنے آیا تھا۔ چھروں اور عمارتوں کو چھوڑ کر اب زمین کی باری آئی تھی اور زمین اُسی طرح فدیم اور جانی پسچانی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب جہاں تک نظر جاتی تھی دہی شیشم کے درخت لکھرے جھوٹتے تھے جن کی جھیاؤں میں ٹوکی جلنگھلنی جاتی تھی۔ آفتاب نے چھاتا بند کر کے پیٹ لیا اور کالی عینک اُتار کر جیب میں ڈال لی۔ اب دھوپ اُس کی آنکھوں کو تکلیف نہ دے رہی تھی۔ سڑک سے اُتر کر کھپتوں کا وہی نقشہ تھا۔ گیموں کی فصل کاٹی جا چکی تھی۔ فصل کی جھوڑی ہوتی سنگی اور خشک زمین اُجاڑ پڑی تھی۔ اس کھرداری زمین کی سطح پر بے شمار چوہے کے بلوں کے سیاہ سوراخ تھے۔ ان سوراخوں کے منہ پر تازہ کھودی ہوئی بادامی مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر پڑے تھے جن کے آس پاس کٹی ہوئی فصل کے بچے کچھے خشک

مکر سے بکھرے ہوئے تھے۔ آفتاب کو یاد آیا کہ یہ سوراخ بہت ڈر والے ہوتے تھے کیونکہ ان میں سانپ ہوا کرتے تھے۔ اب اُسے پنا تھا کہ یہ چوہوں کے بل ہیں مگر ان سوراخوں میں خوف ابھی موجود تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو ان سوراخوں سے بچ کر چلنے کی ہدایت کی۔ ایک چارے کے کھیبت کے کنارے سے گزرنے ہوتے ہوئے چھک کر اُس نے فصل کا ایک لمبا سا بزر تپا توڑا اور اسے دانتوں میں لے کر چبانے لگا۔

ڈنڈ منڈ درخت والے کھیبت میں وہ مرا ہوا قدیم درخت اُسی طرح کھڑا تھا۔ آفتاب اُس سے چند قدم کے فاصلے پر مبہوت کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ درخت اُسی طرح اُس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ اپنے دل میں سوچتا ہوا آیا تھا کہ درخت والی جگہ شابد اُسے نلاش کرنی پڑے گی۔ وہ وہاں سے گزرا ناچا ہتا تھا، وہیں پہنچ کر وہ فاروق کو اپنا فصیر نانا چاہتا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ جھاٹ پوں کی ایک لمبی باڑ کو پار کر کے دوسری طرف نکلا تو سامنے وہ درخت اُسی کا اُسی طرح کھڑا تھا، جیسے کوئی بُت ہو۔ آفتاب آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اُس نے ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے درخت کی ایک تڑی مُڑی ہوئی سیاہ شاخ کو چھوڑا، گویا اُسے ڈر ہو کہ ہاتھ لگانے سے درخت کا درخت دھرم سے نیچے آگرے گا۔ مگر وہ درخت مضبوطی سے اپنی جگہ پر زمین میں گڑا کھڑا رہا۔ اس کا ایک ریشنٹک اور مردہ ہو چکا تھا، مگر اس کی سختی میں، اس کی کربناک تنداٹھان میں، اس کی زمین کی جکڑ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کی چھال کی اکھڑی ہوئی لکھریں تک دہی تھیں، گویا وہ درخت اپنی موت کے ایک لمبے میں منجد ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زمین کا ایک نشان بن گیا ہو۔ صرف اُس سے چند گز کے فاصلے پر شیشم کا ایک ہمیشہ درخت نمودار ہو چکا تھا۔ آفتاب کو یہ

درخت یاد نہیں تھا۔ نئیں سال پہلے کے واقعے کے بعد اس کا ادھر آنا چھوٹ گیا تھا۔ اُس کی ماں نے زمین ٹھیک کے پر دے دی تھی۔ پھر جب آفتاب جوان ہوا تھا توہ حند بارہ اُس کا ادھر آنا ہوا تھا۔ مگر اُس وقت تک ڈسٹرکٹ پورڈ کی ایک کچی سڑک بن گئی تھی جو ان کے کنوں کے پاس سے نکلتی ہوئی احمد پور شریف تک جاتی تھی۔ وہ سائبکل پر اُس سڑک سے آیا جایا کرتا تھا۔ آفتاب نے سر اٹھا کر شیشم کے گھنے درخت کی شاخوں میں دیکھا۔

”ابو میں تھک گیا ہوں۔“ فاروق نے اپنے باپ سے کہا۔

آفتاب نے رد مال نکال کر اپنے بیٹے کا چہرہ خشک کیا۔ ”لبس اب تھوڑی دُورہ ہ گیا ہے۔“ وہ فاروق کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا بولا، ”وہ دیکھو سامنے دکھانی دے رہا ہے۔“

”کہاں؟“

آفتاب نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”وہ درختوں کا جھنڈ دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”اُس کے اندر کنوں ہے۔“ وہ بولا، ”اُس کے ارد گرد کھیت ہیں۔ یہ ہماری نہ میں تھی۔“

”ابو۔“ فاروق نے کہا، ”میں نہیں جاتا۔ میں تھک گیا ہوں۔“

”او منہنک!“ بچہ ٹھنک کر بولا، ”مجھے دھوپ لگ رہی ہے۔ میں نہیں جاتا۔“ وہ جا کر شیشم کے نیچے بیٹھ گیا۔

آفتاب نے ایک طویل نظر اُس مانوس سیاہ جھنڈ پہ ڈالی جو سامنے دو فرلانگ کے فاصلے پر دہیں کا دہیں موجود تھا۔ جلتی ہوئی دھوپ میں

کھڑے کھڑے آفتاب نے اپنے گالوں پر اُس جھنڈ کی ٹھنڈی چھاؤں کو محسوس کیا۔ اور اُس نے محسوس کیا چھاؤں کا یہ لمس اتنا مانوس تھا اور اتنے قریب سے آیا تھا کہ گویا اس بات کو بھی بیس دن بھی نہ گزرے ہوں جب وہ ان درختوں کے سائے میں بیٹھا ستارہ تھا۔ اُس کا حلقہ خشک ہوا کٹوڑہ پیسے اب اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں جا کر ٹھنڈی لسمی کا بھرا ہوا کٹوڑہ پیسے اب یہاں پر کون لوگ رہتے ہوں گے؟ آفتاب نے چیرت سے سوچا۔

”ابو والپس حلپیں۔“ اُس کے بیٹے نے کہا۔

چھاؤں کا وہ جھونکا پیک جھیکنے میں گزر گیا۔ آفتاب جا کر اپنے بیٹے کے پاس شیشم کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”ذرادم لے کر چلتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”ابو کہانی کب سنائیں گے۔ ما فاروق اکٹھے ہوئے ہجے میں بولا، جیسے صبر کر کر کے تھک گیا ہو۔

آفتاب نے نظر اٹھا کر دھوپ میں دور دور تک دیکھا۔ سامنے وہ ننگا درخت اپنی ٹیڑھی میڑھی شکل یہے بے جنبش کھڑا تھا، جیسے کسی ڈراؤنے خواب کی شکل ہو۔ آفتاب نے جیب سے کالی عینک نکال کر آنکھوں پر لگا لی۔ پھر وہ اپنے بیٹے کو کہانی سنانے لگا۔

دھیمی، ٹھہری ہونی آواز میں آفتاب نے اپنے بیٹے کو تیس سال پلے کا وہ قصہ سُنا یا جس نے اس کی زندگی کو جھکڑ کے رکھ دیا تھا۔ گویہ قصہ اول سے آخر تک جوں کا تول محفوظ تھا، مگر شروع نشر و ع میں آفتاب کو بلنے میں وقت محسوس ہونی۔ اُسے الیسا رگا کہ جیسے کوئی شے زمین میں گھری دفن ہے اور وہ کھود کھو دکر اُسے نکال رہا ہے۔ کچھ دیر تک وہ رُک کر بولتا رہا، جیسے واقعات کو چُن چُن کر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھتا جا رہا ہو مگر کوتی کٹی نہ ملتی ہو۔ سپھر گویا اس کی آواز سے واقعات کے ان تنکوں میں

جان پڑنے لگی۔ جیسے جیسے دہ بولنا گیا یہ تسلی کیریں زمین پر پڑی پڑی سُر
سرانے لگیں اور پھر ایک دوسری کے گرد کنڈل مالہ کر زنجیر کی شکل بنتی گئیں۔
اہستہ آہستہ آفتاب اس زنجیر میں بند ہتنا گیا اور اس کے خیال میں روانی
آنی گئی۔ اُس نے الفاظ کو اپنے منزہ سے نہیں نہیں تیر پر پرندوں کی مانندہ پھر
سے اڑ کر نکلتے ہوئے اور آواز کے رستے انہیں وقت کے ایک نقطے میں گم
ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس تپش آلو دوپر میں درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے آیا۔
نے اپنی عمر کی طویل اندھی سُرناک کو سکڑتے ہوئے دیکھا حتیٰ کہ دُور سے
اُس کا روشن سر اُس کی آنکھوں کے قریب اُکھا رُک گیا اور اُس نے ایک ایک
بات کو، ایک ایک لمبے کو اپنی جلد کے اوپر سر سراتے ہوئے اس طرح محسوس
کیا جیسے تیس برس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ جیسے وقت کی اور عمر کی اور
آدمی کے بدن تک کی کوئی حقیقت نہ ہو بلکہ صرف ایک شے پر دنیا کا
وجود قائم ہوا اور وہ آدمی کے دل کی یاد ہو جو نسل درسل دنیا کو بازدھتی
ہو۔ اُس نے زمین سے نظر اٹھا کر اپنے بیٹھے کے منہک چہرے کو دیکھا اور
لما نہ کرہا کر اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا، جیسے زنجیر کا سر اُس
کو منتقل کر رہا ہو۔ وہ اپنی کہانی کے اختتام کو آپسجا تھا۔

اس کہانی میں آفتاب نے صرف ایک بات کی تبدیلی کی تھی۔ اُس نے
یہ نہیں بتایا کہ جس شخص کے ساتھ وہ تیس برس پہلے آج کے روز شہر سے
باہر گھومنے کو گیا تھا اور حس نے گھر والیس اُکھے کچھ کہے سئے اور ظاہر کیے بغیر
اپنے آپ کو بندوق مار لی تھی وہ اُس کا باپ تھا۔ یہ بات بتانے کی اُسے
ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شخص ان کا ایک ہمسایہ تھا۔

کہانی ختم کر کے دہ دلوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ والپی پر دھوپ میں
چلتے ہوئے آفتاب نے نہ کالی عینک نکال کر لگائی نہ چھاتا کھولا۔ وہ سورج
کی تپش سے بے نیاز ہو کر چلا جا رہا تھا۔ اس کا دل خالی ہو چکا تھا، مگر اُس

کا جسم ہر کا پھیل کا اور مضبوط تھا۔ اُس کے ذہن میں اس وقت کو فی سوچ نہ تھی، مگر اُس کے بدن میں یہ ایک احساس تھا کہ اُس کے لڑکپن کا یہ شر اُس کا شر تھا، یہ کھیت اور یہ درخت، یہ رٹکپن جن پر اب تانگے اور موٹریں دھول اڑا رہی تھیں اور بازار جن میں اب قلعی اور فالودے کی ریڑھیاں سمجھی تھیں اور موتیے کے ہار نیچپے والے نکل آئے تھے، یہ گلیاں جن میں عورتیں اپنے دروازوں کے بیچ دہلیزیں اور تھڑوں پر بیٹھی پنکھیاں جھصل رہی تھیں اور گرمی سے مونہ کھولے سالنس لستی ہوئی باتیں کر رہی تھیں اور بچے گرمی سے بے پرواہی میں گرتے پڑتے ہوئے کھیل رہے تھے، یہ گھر جن کے اندر کو رے گھڑوں اور لوہے کے ٹھنڈے کٹوڑوں کے بچنے کی آوانیں آرہی تھیں اور کسی کسی صحن سے امن اور پیاز کے بگھار کی تیز خوشبو نکل کر چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ آفتاب کے بدن میں یہ ایک اندھ احساس تھا کہ یہ ساری جگہیں اس کی جگہیں تھیں۔ میں برس ہوئے وہ اپنا شر چھوڑ کر چلا گیا تھا مگر ان میں برسوں میں جہاں جہاں بھی وہ رہا تھا، لا ہو رہا میں جہاں اُس کا مکان تھا اور ان شروں میں جہاں کام کی خاطر اُس نے کچھ وقت گذران تھا اور دوسری جگہوں میں جہاں سفر کرتے ہوئے اُس کا گزر ہوا تھا یہ کیفیت کبھی اُس پر طاری نہ ہوئی تھی جواب اُس پر تھی مابہ کیفیت جو بدن کی بے خبری کی کیفیت تھی۔ تیس برس تک اُس کا دل شل رہا تھا مگر بدن ایک ایک لمحہ ایک بے نام اور بے نشان ڈر سے پھر کتا رہا تھا، جیسے کسی آن کو فی عقب سے چھپٹ کر دبوچ لے گا۔ اب یہاں جسم بے بو جھد تھا اور پھر آرام سے پڑے ستاتے تھے جیسے اُن کو اپنی کوتی خبر نہ ہو، صرف دل ایک باخبر جگہ تھی۔ پہلی بار نہ ندگی میں آفتاب کو علم ہوا کہ وہ دو لفظ جو بارہا اُس نے لوگوں کی زبانی مئے تھے، ”میرا شہر“، ان دونوں کے اصل معنی کیا تھے۔

ہوٹل کے آگے ایک مختصر سے باعثیچے میں آفتاب اور فاروق آمنے سامنے کر سپول پہ بیٹھے کو کا کولا پی رہے تھے۔ بوتلیں میز پر رکھی تھیں۔ برف کی لگی ہوئی بوتلوں پر دونوں باب پیٹھے کی انگلیوں کے نشان تھے۔ ان نشانوں سے اور پہ شیشے پر اجنماد کی جھٹلی اب تڑخنے لگی تھی۔ اس کی صاف تینی ہوئی سطح پر جگہ جگہ گنجُل پڑھکے تھے جو پانی کے ننھے ننھے قطروں کی شکل میں ڈھنک ڈھنک کر زمُرے مٹرے راستے بناتے جا رہے تھے۔ شام پڑھ رہی تھی۔ باعثیچے کے گرد اگر دین تین فٹ کی دیوار تھی جس کے پرے مرک پر تانگوں، موڑوں اور پیدل چلنے والوں کا دوسرا بیلا شروع ہوا رہا تھا۔ رات کی گاڑیوں کا دفت ہونے والا تھا اور تانگے والے سٹیشن کی ہانگ لگا رہے تھے۔ شام کی سیر کے لیے لوگ نہاد حصو کرے والوں میں کنگھی کیے، سفید مل کے کہتے ہنے مرک پر آنکھے تھے۔ فاروق اٹھ کر دیوار کے قریب رکھی ہوئی ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ اُس نے کرسی سے ٹیک لگالی اور ٹانگیں باعثیچے کی دیوار پر رکھ کر اپنا کوئی پڑھنے لگا۔ چند منٹ کے بعد آفتاب نے اپنی بوتل اٹھائی اور فاروق کے ساتھ والی کرسی پر جا بیٹھا۔

”کہاں اچھی لگی؟“ آفتاب نے پہلی بارہ اپنے بیٹھے سے پوچھا۔
فاروق نے حلق سے سُنی نہ سُنی کی بے معلوم سی آوانہ لگالی اور گھٹتے ہوئے اجایے میں کوئی پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہوٹل کے بعد آمدے میں ایک چھوٹا سانچا بلب جل رہا تھا جس کی ناکافی روشنی ان تک پہنچ رہی تھی۔ آخر فاروق نے نھک کر نظر کو کس سے اٹھا لی۔

”ابو۔“ اُس نے اچانک پوچھا، ”آپ یہ کہاں لکھیں گے؟“

”ٹاید کھوں۔“ کچھ دیکھ کر آفتاب نے بواب دیا۔

”ابو۔“ فاروق پھر بولا، ”اگر آپ کہاں نہ لکھیں تو سب سے پڑے دیں

جن جائیں؟“

آفتاب ہنس پڑا۔ ”یہ نم سے کس نے کہا ہے۔“
”امی نے۔“

”کہتی ہیں اگر ابو کھانیاں لکھنے میں وقت ضائع نہ کریں تو سب سے بڑے
وہیں جائیں۔“
آفتاب ہنس کر خاموش ہوا۔

”فاروق۔“ آفتاب نے کھانیاں میز پر رکھ کر اپنے بیٹے کو مخاطب کیا،
”میں یہ کہانی لکھوں؟“

فاروق نے پھر عدم دلچسپی کی نہی سی آداز نکالی اور سڑک کو دیکھنا رہا۔

”پھر ایک بات بتاؤ۔“ آفتاب نے بات جاری رکھی۔
”کیا۔“

”انہوں نے اپنے آپ کو بندوق کیوں مار لی تھی۔“
”پتا نہیں۔“

”نہیں بھئی، سوچ کر بتاؤ۔“ آفتاب نے اصرار کیا۔ ”نم بتاؤ گے تو پھر کہانی
لکھوں گا۔“

”کیوں۔“

”مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی۔“

فاروق چند سکنیدہ تک جیرانی سے اپنے باپ کے چہرے کو دیکھنا رہا،
پھر ہوئے سے مُنڈ مور کے سڑک کو دیکھنے لگا، جیسے سوچ میں ہو۔ پچھر دیتے تک دلوں
باپ بیٹا چپ چاپ ہٹھیے رہے۔ آفتاب کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔
اُس نے اپنا ابو جھک کہنیوں پہ ڈالا اور میز پر جھک گیا۔ اُس کے بدن کا خدشہ
لوٹ کر آ رہا تھا۔

اچانک فاروق نے پلٹ کر اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

پچے کی آنکھوں میں چمک تھی۔

”شاید انہیں گھوڑے سے اچھے لگتے تھے۔“ وہ بولا۔

آفتاب کی نظر دل کے سامنے کی دُھنند حاضر نہیں تھی۔ روشنی کا ایک ہمین سا نقطہ اُس دُھنند میں پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ اُس شفاف دارے کے اندر ایک نقرہ بیخ پاتھا۔ سوہج کی روشنی اُس کے سفید بدن پر اس تیزی سے چمک رہی تھی کہ نظر نہ ٹھہر نی تھی، اور تنے ہوئے جسم کا ایک ایک پیٹھ نمایاں تھا، جیسے پھر سے کامائی گیا ہو۔ گھوڑے کی لپٹت پر ایک شہسوار اس کی باگیں تھا میں جم کر بیٹھا تھا۔ سوارہ انگریزی فوج کے سپاہیوں کی سفید دردی اور ہبیٹ پہنہ تھا اور اُس کے ہاتھ میں نگی نوار تھی جو آسمان کی جانب اُٹھی ہوئی تھی۔ گھوڑا اور سوارہ اس طور پر ایک دوسرے سے ملے ہوا میں اُٹھتے تھے جیسے یک بدلن ہوں اور ایک ٹاپ میں زمین کو سچلانگ جائیں گے۔ نام کے اندر ہرے میں آفتاب کمپنیوں کے بل جھکا آنکھیں پھیلائے اس حسن اور توازن کی چمک دار تصویر کو دیکھتا رہا تھا کہ دُھندر کا حلقة پھر اس کی نظر کے گرد تنگ ہونے لگا۔ یہ منظر جب تیزی سے ظاہر ہوا تھا اُسی تیزی سے غائب ہو گیا۔ مگر اس منظر کے ایک لمبے میں آفتاب کو اس بات کا علم ہوا کہ یہ اُس کے باپ کی زندگی کا لفیض ترین لمبہ تھا۔

رات پڑ رہی تھی۔ ایک لمحے کی چمک اب گزر چکی تھی۔ اس اندر ہیرے میں اب ایک بات اور اُس کے مقابل آکھڑی ہوتی تھی۔ وہ شفاف لمحہ پنے پھیپے اپنا سایہ چھوڑ گیا تھا، گویا ایک بات ظاہر ہو گئی ہوا اور ایک پوشیدہ! یہ شہر، آفتاب سوچ رہا تھا، جہاں میرے باپ نے اپنی عمر گزاری تھی، اُس کے دل سے اُتر گیا تھا۔ اور میں جو اس شہر کو چھوڑ گیا تھا، یہاں آگر دبارہ زندہ ہو گیا ہوں۔ یہ کیا بات تھی؟ — اُس کے دل کی اُبھن دوڑ ہو گئی تھی تاہم وہیں پہ موجود تھی۔ صرف ایک بات کا اسے قطعی طور پر علم تھا، کہ

وہ اس شہر کا باسی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

اب رات پڑھ گئی تھی۔ مٹرک کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ سامنے دلے کچھے کے بلب کی روشنی باعینچے میں پڑھ رہی تھی۔ اُس مدھم روشنی میں فاروق مانگیں دیوار پر رکھے پھر انپے کوک کے درق الٹ رہا تھا۔

”ابو۔“ اچانک فاروق بولا، ”میں بڑا ہو کر امریکہ جاؤں گا۔“

آفتاب نے چونک کراپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ بچے کی آنکھوں میں چمک تھی۔ آفتاب آنکھیں چھیلاتے اُسے دیکھتا رہا۔

”اچھا۔؟“ اُس نے بے خبالی سے کہا۔

”میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور امریکہ جاؤں گا۔“ بچے نے کہا۔

اُس کی گود میں کوک کھلا پڑا۔ اس کے صفحے پر ایک دیو قامت بیاہ آدمی ایک چوڑی سی سٹرک پار کر رہا تھا اور اُس کے پاؤں کے ارد گرد لمبی لمبی کاربیں آجائے ہی تھیں۔ فاروق منہ موڑ کر مٹرک کو دیکھنے لگا تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں ایک دُور کی جھلک تھی۔

پچھر دبیر کے بعد آفتاب کوئی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، جیسے کوئی بات کرنے والا ہو، پھر اُسے وہیں چھوڑ کر ہوٹل کی عمارت کے اندر چلا گیا۔ ہوٹل کے ہال میں چند لمحتے ناک ڈک کر وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ سپرھیاں چڑھنے لگا۔

چند منٹ کے بعد جب فاروق نے جا کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر اندر صیرا نہا۔ اُس نے اچک کر تی جلا دی۔ اُس کا باپ اُسی طرح کپڑے اور بوٹ جوابیں پہنے اپنی چارہ پاتی پر سیدھا لیٹا نہا۔ اُس کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ملے آرام سے اُس کے سینے پر رکھے تھے اور اُس کا چہرہ پینے سے نر تھا۔ کمرے میں سخت گرمی تھی۔

”ابو۔“ فاروق بولا، ”پنکھا چلا دُول؟“

آنتاب کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ فاروق جل کر اُس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”ابو۔“ اُس نے آہستہ سے پکارا۔

آنتاب نے آنکھیں کھول دیں اور چھت کو گھورنے لگا، گویا پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”چلا دو۔“ اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

”ابو مجھے مُھوک لگی ہے۔“

آنتاب اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے غسل خانے میں جا کرہ مدنہ پہ ٹھنڈے پانی کے چینیٹے مارے اور تو یہ سے چہرہ خشک کیا۔ پھر وہ اپنے بیٹھے کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔

”ابو والپس کب جائیں گے؟“ فاروق نے پوچھا۔

”صبح سویرے۔“

وہ دونوں سیرھیاں اُنہ کہ کھانا کھانے کے لیے چلے گئے۔

+++

لشیب

(نائلٹ)

میں ہر ماہ ایا ز سے ملاقات کے لیے لاہور جاتا رہتا ہوں۔ اس مرتبہ گیا تو باتوں باطل میں ایا ز نے ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا جس نے مجھے کئی برس پہلے کا گذر رہا وقت یاد دلا دیا۔ میں کل ہی لاہور سے والپس آیا ہوں، اور اس واقعے کی ایک ایک بات ابھی تک گویا میری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ یہ واقعہ میری اور ایا ز کی زندگی کے تانے میں اس طرح بنا ہوا ہے کہ اسے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں۔

ایا ز بیک میر ابھپن پ کا دوست ہے۔ جس وقت کی یہ بات ہے اس وقت وہ لاہور کا ایک ابھترنا ہوا نوجوان دکیل تھا۔ حال ہی میں اس نے دو مشہور مقدمے لڑے تھے۔ پہلا قتل کا مقدمہ تھا جس میں ایک بڑے زمیندار کے بیٹے نے کسی نماز عے پر ایک کاشت کار کو ہلاک کر دیا تھا۔ دوسرا سیاسی نوعیت کا مقدمہ تھا، جس میں انخواہ، رشوت تشدد وغیرہ سب شامل تھے۔ ان مقدمات میں چونکہ بڑے بڑے بااثر لوگ ملوث تھے اس لیے اخبارات میں ان کی خوب تشهیر سو فیصد تھی۔ سبقتوں تک اور اق کے اور اق عدالتی کارروائی سے سیاہ ہوتے رہے۔ ایا ز ایک مقدمہ جیت گیا اور دوسرا ہار گیا تھا۔ مگر اس کی شہرت کی اصل بنیاد اس کی انسان دوستی پر تھی۔ یہ مقدمے اس نے غریب اور بے اثر فرلق کی حمایت میں لڑے تھے۔ ان دونوں شہر کے پڑھے سکھے نوجوان طبیعت میں ایا ز ایک ایسے شخص کی حیثیت سے شہرت حاصل کرتا جا رہا تھا جس نے بعد عنوانی اور بالادستی کے خلاف سی تھیا را ٹھار کھے ہوں۔ اس کے دشمنوں کا کہنا تھا کہ اس انداز میں تمام تر انسان دوستی کے جذبات ہی کار فرمان ہیں بلکہ اس کی سیاسی امنگروں کا عمل دخل بھی تھا، جن کے حصول کی خاطر وہ ہنایت ہو شیاری سے رستہ ہموار کر رہا تھا۔ میرے ساتھ بات چیت میں اگرچہ ایا ز نے کبھی ایسی بات کی جانب اشارہ ہیں کیا تھا مگر مجھے احساس تھا کہ اگر مستقبل میں کسی وقت سیاست کا دروازہ

اس پہ کھل گیا تو وہ سیاسی عمل میں اسی جوش و خردش سے کو دڑپ سے گاہی سے کر وہ اپنی زندگی کے تمام تر کام کرنا آیا تھا۔

ہم دونوں ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے۔ ہم ایک ہی محلے میں پل کر بڑے ہوئے اور ایک ہی پرانی اور ہائی سکول میں تعلیم پانے کے بعد اپنے شہر کے انٹر میڈیم کالج میں داخل ہوئے تھے۔ ایاز کی طالب علمی کا زمانہ عجیب طرح سے وہکے کھا کھا کر آگے بڑھا۔ پانچویں جماعت تک وہ کلاس کا سب سے نالائق رہ کا تھا۔ اس کو نہ پڑھنا لکھنا آتا تھا نہ ہے نہ پہاڑے کبھی اس نے گھر کا کام نہ کیا تھا۔ سب روز کلاس میں اسے مار پڑا کرتی تھتی۔ مگر جو نہیں ہم نے پانچویں جماعت پاس کی اور سکول بدل کر بڑے سکول میں پہنچے، یوں معلوم ہوا جیسے ایاز کو پر لگ گئے ہوں۔ کہاں وہ کلاس میں سب سے پیچے گھستا چل آرہا تھا، کہاں اب وہ سال کے امندر اندر چونی کے لذکوں تک پہنچ گیا۔ ویکھتے دیکھتے اس کی ہمیت بہل گئی۔ اس کے بہار میں صفائی اور ترتیب آگئی۔ اس کے بال کنگھا کیے اور جوتے پالش سے چلتے ہوئے ہوتے۔ ہم لوگ اس وقت دس گیا رہ برس کے تھے، اور اس عمر میں بچے صرف ایک دوسرے کی جسمانی قوت سے مروعہ ہوتے ہیں۔ تاہم کلاس کے سب رڑکے ایاز کی اس آنا فانا تبدیلی پر حیران تھے۔ ایاز کی ترقی کی رفتار اگھے تین سال تک اسی طرح قائم رہی۔ جب ہم نویں جماعت میں تھے تو اس کے والد کا اچانک استعمال ہو گیا۔ اس کے بڑے بھائی افتخار کو جو اسی سال میکر پاس کر کے کالج میں داخل ہوا تھا، پڑھانی چھوڑ کر اپنے باپ کی چھوٹی سی کپڑے کی دکان سنبھالنا پڑی۔ ان کے باپ نے اپنے دونوں بیٹوں کو کبھی دکان کے کام میں نہیں لگایا تھا، یہاں تک کہ وہ ان کو درست کر دہاں رکنے بھی نہ دیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بیٹے تعلیم حاصل کر کے سرکاری لوز کری کریں۔ جب افتخار نے دکان پر بیٹھنا شروع کیا تو اسے اس کار دبار کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ چنانچہ ان کی آمنی دن بدن کم ہونے لگی۔ اسی دوران میں ایاز نے اپنی پڑھائی سے لاپرواں بر ترا شروع کر دی۔ کلاس میں اس کی پوزیشن چلسنے لگی، اور استاد اس کے بارے میں نکر مند نظر آنے لگے۔ اس سال

کی گرمیوں کی چھپیاں مجھے بھی طرح سے یاد ہیں، کیونکہ وہ ساری چھپیاں میں نے افتخار اور ایاز کے ساتھ ان کی دکان پر گزاری تھیں۔ ایمانہ باقاعدگی سے صفحہ اپنے بھائی کے ساتھ دکان پر چلا جاتا۔ میں بھی پڑھنے کا بہانہ کر کے کتا میں کاپیاں لے کر صفحہ ہی صفحہ ان کی دکان پر پہنچ جاتا۔ پھر ہم تینوں بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہتے۔ کبھی کبھار کوئی دیہاتی منڈی میں جس سپنج کر یا کچھری میں کوئی مقدمہ بھیگت کر والپس جاتا ہوا دکان خالی دیکھ کر اندر چلا آتا، اور دو چار گز چینٹ یا کورالٹھا خرید کر چلا جاتا۔ وہ گرمیوں کی چھپیاں مجھے صرف ایک منظر کے حوالے سے یاد ہیں، گویا اس سارے موسم کا نجود اس ایک جھلک میں ہے۔ یہ منظر اس چھوٹی سی کپڑے کی دکان کا ہے جس کے خانے کپڑے کے تھانوں سے خالی ہوتے جبار ہے یہی اور کوئی اس دکان میں نہیں آتا، صرف ہم تین لڑکے اندر میلے چھوٹ دار کپڑے کے نرٹش پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ جب سہ پر کے وقت پیش بڑھ جاتی تو افخار اٹھ کر دکان کا سائبان نیچا کر دیتا اور چھڑہ رومال سے ڈھک کر، سرگاؤ تیکے پر رکھ کر آنکھیں موند لیتا اور سوتے جا گتے میں بازو ہلا ہلا کر کاٹتی ہوئی ٹکھیوں کو اڑاتا رہتا۔ میں اپنی کاپی اور کتاب کھول کر سکول کا کام ختم کرنے کی کوشش میں لگ جاتا۔ اُن کی دکان کے بغل میں دسالوں اور کریے کے نادلوں کی ایک دکان تھی۔ ایمانہ دہائی سے کوئی نادل مفت ماؤگ کرے آتا اور اسے پڑھتا رہتا۔ ان چھپیوں میں ایاز نے ”سودائی“، اور ”ہر جانی“، ”نام“ کے دوزادل چار چار پانچ پانچ مرتبہ پڑھ دیے۔ اس بات کو ایک زمانہ پوچھا ہے مگر آج بھی مجھے ان نادلوں کی کہانیاں، جو ایاز نے سنائی تھیں، یاد ہیں۔ سکول کا کام کرتے ہوئے جب مجھے کوئی وقت پیش آتی تو میں ایاز سے پوچھ لیتا۔ اکثر اوقات وہ میری کتاب یا کاپی دیگرہ دیکھے بغیری صرف سوال سن کر اس کا جواب یا حل کرنے کا طریقہ زبانی مجھے تبادلتیا۔ پھر وہ اپنا نادل پڑھنے لگتا۔ چھپیوں بھراں نے سکول کی کتاب کو کھول کر نہیں دیکھا، جیسے اس کو کوئی پردا نہ ہو۔ سکول کھلنے پر اس نے سب ماستریوں سے یہ کہہ دیا کہ اس کے کام دالی تمام کاپیاں ایک روز پہلے دکان پر رکھی تھیں کہ کوئی امتحا کرے گی ہے۔ اس روز نہیں ماسٹر کے سامنے اس کی پیشی ہوئی۔ نہیں ماسٹر کے سامنے صرف لڑکی

اور مار پیٹ پر پیشی ہوا کرتی تھی۔ یہ پہلی بار تھی کہ کلاس کے ماستر کے پڑھائی کے بارے میں کسی لڑکے کی پیشی کرانی تھی۔ ہم سب کی نظریں ہمیڈ ماستر کے دفتر پر لگی ہوئی تھیں اور ہمارے چھوٹے چھوٹے دماغوں میں مبالغہ آمیز خیالات چلے آ رہے تھے۔ جماعت کے مختلف رنگ کوں کی رائے یہ تھی کہ ایاز کو سکول سے نکال دیا جائے گا۔ مگر جب ایاز ہمیڈ ماستر کے کرے سے نکل کر آیا تو اُسی کا اُسی طرح تھا۔ اس کی شکل و صورت سے کسی قسم کی سزا کے آثار ظاہر نہ تھے۔ وہ آگر کلاس میں بیٹھ گیا اور پڑھائی شروع ہو گئی۔ جھپٹی کے وقت جب ہم نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہمیڈ ماستر نے اسے نہ مارا ہے نہ پہنچا ہے بلکہ اپنے پاس بجھا کر سمجھایا ہے کہ اسے اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دینی چاہیے، کیونکہ اگر وہ محنت کرے تو سکول کا بہترین طالب علم ہو سکتا ہے، دغیرہ دغیرہ۔ ہمیڈ ماستر کی پیشی کے باوجود ایاز کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اب اس نے سکول سے غیر حاضر یا بھی کرنی شروع کر دیں۔ اس کی ماں نے محلے والوں کے کپڑے دغیرہ سینے کا کام شروع کر دیا تھا، چنانچہ وہ شام کو اپنی ماں کے ساتھ، یا کبھی اکیلا، کپڑے ادھر ادھرے جبایا اور لایا کرتا تھا۔ دن کو وہ اکثر اپنے بھانی کے پاس دکان پر بیٹھا رہتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال کے آخر میں وہ پاس تو ہو گیا مگر مشکل سے۔ کلاس کے آخری لڑکوں میں اس کا نمبر آیا۔

دوسری جماعت کے دو مہینے گزر چکے تھے اور گرسیوں کی چھپیاں ہرنے والی تھیں کہ ایاز میں ایک بار پھر اچانک تبدیلی رو نہ ہوئی۔ اس نے باقاعدگی سے سکول آنا اور سکول کا کام کرنے شروع کر دیا۔ چھپیوں کے دوران میں کئی بار ان کی دکان پر گیا، مگر اب ایاز نے دکان پر بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کی دکان سے میں ان کے گھر جانا تو ایاز کو گھر کی چھوٹی سی بیٹھک میں پڑھائی کرتے ہوئے پاتا۔ اس نے باہر آنا جانا کھیلنا کو دنا دغیرہ نہ کر دیا تھا، میہان تک کہ کئی بار میں گھسنے تک اس کے پاس بیٹھا رہتا اور وہ میری باتوں کا ہر ماں میں جواب دیتا ہوا پڑھائی میں مشغول رہتا۔ اس کے بھائی افتخار کو اب دکان کے کام کا کچھ تجربہ ہو چلا تھا، چنانچہ ان کی آمد فی